انتیسواں سفر ۔ سفر امریکہ، سان فرانسسکو

اسلام آباد، اور پھر السو برانتے میں ہمارا ایک اور وطن

ایک مرتبہ قدم ایک جگہ سے اُکھڑ جائیں تو نئی جگہ خود کو مضبوط و محفوظ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ آج ہم سوچتے ہیں.....

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

دَور بدلتے ہیں تو انسان خود کو بدلنے کی کوشش کرسکتا ہے۔ جگہ بدلے تو مشکل زیادہ ہوتی ہے۔ ہم پاکستان آئے تو برسوں تک لوگوں کی نظروں میں دیکھی اور زبانوں سے سُنی، ایسی اجنبیت جو احساس دلاتی رہی کہ تم ہم میں سے نہیں ہو، مہاجر ہو۔ اگر اس کو درگزر کرنا چاہا تو اس کا مزید احساس دلایا گیا۔ پاکستان میں ہماری ساری اولادوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اچھے عہدوں پر فائز ہوئے۔ لیکن پاکستان کے حالات اور یہاں ہندوستان کے مہاجروں کے ساتھ کا خصوصی برتاؤ دیکھ کر کسی کو بھی سکون نہیں تھا۔ پھر یہ دماغ میں آیا کہ اگر یہ خصوصی برتاؤ برداشت کرنا ہی ہے تو ایسی جگہ کیا جائے جہاں اپنی سوچ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی آزادی زیادہ ہو۔ ۱۹۸۷ء میں صادقین کے انتقال کے بعد ان کی بہترین تصاویر اسلام آباد کے نمائش گھر کی زینت بنیں اور کراچی کے نام کم ہی آیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، کچھ انہی حالات کے تحت ہمارے دوسرے صاحبزادے شمس امریکہ میں جا بسے تھے۔ اسی طرح مارچ ۱۹۸۴ء میں چوتھے صاحبزادے اعجاز بھی ڈاکٹری کا

امتحان پاس کر کے امریکہ روانہ ہو گئے تھے۔ یہاں کراچی میں ہم اپنے ادبی ماحول میں گھرے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ ساداتِ امروہہ مرکز میں ٹرسٹی کی ذمہ داری بھی لے لی۔ وہاں مشاعروں میں بھی شرکت ہوتی رہی، اور دوسری معاشرتی محفلوں میں بھی محو رہے۔

کراچی امروہہ مرکز: سالانہ خواتین مشاعرہ ۱۹۸۶ء میں سلطانہ آدا کلام پڑھ رہی ہیں۔

اسلام آباد سے تعارف

اسی اثناء میں ہمارا اسلام آباد سے بلاوہ آ گیا۔ وہاں بڑے بیٹے نجم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مقیم تھے اور سردیاں شروع ہونے سے پہلے مری دیکھنے کی دعوت تھی۔ ہم نے پاکستان کے اس نئے دارالخلافہ کی تعریف تو سنی تھی، اب دیکھنے کا موقعہ ملا تو ہم نے فوراً حامی بھر لی۔

سارا انتظام ہماری بڑی بیٹی رعنا نے کیا اور اس طرح ہم رعنا اور سیما کو ساتھ لے کر چلے۔ تیز گام سے سلیپر کلاس کی تین نشستیں مخصوص کروائیں تھیں۔ اس کمپارٹمنٹ میں چار نشستیں ہوتی تھیں جو آرامدہ اور بڑی تھیں۔ ہر مسافر کے لئے الگ سونے کا انتظام تھا اور بوگی میں یہ ایئر کنڈیشنڈ حصّہ تھا۔ ہمارے ساتھ چوتھی مسافرہ ایک بزرگ خاتون تھیں۔ ان کے ساتھ تقریباً ایک درجن مختلف قسم کے پودوں کے گملے تھے جو انہوں نے باتھ روم میں رکھوائے تھے۔ باتھ روم کافی صاف ستھرا تھا، لیکن ان گملوں کی وجہ سے یہاں جگہ کم ہو گئی تھی۔

یہ خاتون اکیلی تھیں اور کافی ضعیف سی تھیں۔ رعنا سے ہر دو گھنٹے کے بعد کہتیں، ''بیٹی، ذرا دیکھ لینا، میرے گملے گرتو نہیں گئے۔ اور تھوڑا سا پانی بھی ڈال دینا ان میں''۔ رعنا بھی شاید ان کو پسند کرنے لگیں تھیں اور ان کا پورا خیال رکھ رہی تھیں۔ پودوں کے گملے شاید ان کے گھر کے تھے اور اب یہ دوسرے بیٹے کے پاس چلیں تو گملے ساتھ تھے۔ لاہور پہنچے تو یہ اتریں۔ چند منٹ کے بعد ان کے صاحبزادے اندر آئے اور ہم سب کا بہت شکریہ ادا کیا۔ پھر وہی پاکستانی انداز جو ہمیں بہت پسند ہے، ہمیں بہت اصرار کے ساتھ کہا کہ ''کبھی لاہور آئیں تو ہمارے گھر ضرور آئیں''۔

راولپنڈی اسٹیشن پر نجم اور ان کی صاحبزادی حنا ہمیں لینے کے لئے پہلے سے موجود تھے۔ اسلام آباد کا ہمارا یہ پہلا سفر تھا اور زیرو پوائنٹ کی سڑک سے ہی ہم اس شہر کو کافی پسند کرنے لگے۔ صاف ستھرا، کھلی کھلی سڑکیں، اور سبز پہاڑیاں۔ نجم کے گھر تک پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی اور دوسرے دن تک ہم نے آرام کیا۔ دوسرے دن شہر دیکھنے نکلے تو ایک ہی دن میں پورا شہر دیکھ ڈالا۔ شاہ فیصل مسجد، سیکریٹیریٹ، شکر پڑیاں، راول ڈیم، اور پھر ''شہر''۔ نجم کی سوزوکی FX میں ہم آٹھ نفس، جن میں نجم کی چھوٹی بیٹی ثنا کی عمر ابھی چھ سال کی تھی اور بیٹے علی صرف دو سال کے تھے۔ لیکن اپنا خاندان تھا، لہذا پورا دن اسی کار میں خوشی سے گزارا۔

اگلے ہفتے ہم سب مری کی طرف چلے۔ اکتوبر ۱۹۸۸ء کا آخری ہفتہ تھا۔ اسلام آباد میں تو موسم معتدل تھا لیکن مری کی سڑک پر ایک دم دُھند آگئی، اور ایسی دُھند کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ تمام کاروں اور دوسری گاڑیوں نے روشنیاں جلائی ہوئی تھیں۔ ہم نے نجم کو رائے دی کہ کسی دوسرے دن مری جانے کا منصوبہ بنائیں اور فی الحال گھر واپس چلیں۔ لیکن وہ ہمیں مری اور ایوبیہ دکھانے کے جوش میں اسی حالت میں اس سوزوکی کو آٹھ مسافروں سمیت مری کی پہاڑی سڑک پر چڑھا کر لے گئے۔ یہاں امریکہ میں ہم نے دیکھا ہے کہ لاس انجلس جاتے ہوئے فری وے ۵ پر ایک جگہ ایک نسبتاً خفیف سی چڑھائی آتی ہے۔ وہاں ہمیں راستے میں درجنوں کاریں انجن گرم ہونے کی وجہ سے رُکی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لیکن یہاں ہم نے کوئی سوزوکی نہیں کھڑی دیکھی، جس سے اندازہ ہوا کہ یہ چھوٹے انجن کی کار واقعی اس مد میں بہت اچھی کار تھی۔

مری پہنچے تو کہر، یا اسے بادل کہہ لیں، اتنی گھنی نہیں تھی۔ البتہ نجم کو پھر بھی اپنا ریسٹ ہاؤس تلاش کرنے میں اس کہر سے کافی دقّت کا سامنا کرنا پڑا۔ جب تک ریسٹ ہاؤس پہنچے، دوپہر کے کھانے کا وقت نکل

چکا تھا اور میس بند ہو چکا تھا۔ نجم نے وہاں باورچی سے انڈوں کے آملیٹ بنوائے اور اس طرح ہم نے کھانا کھایا، اور اب باہر نکلے گھومنے کے لئے۔ سردی کافی تھی، لیکن ناقابلِ برداشت نہ تھی۔ اِدھر اُدھر گھوم پھر کر اس ہلکی ہوا میں گہری گہری سانسیں لیں تو تھکن بھی جلدی دور ہوگئی۔ حنا نے بتایا کہ اتنی اونچائی پر ہوا میں آکسیجن کم ہوتی ہے اس لئے میدانی علاقوں کے لوگ یہاں جلد تھک جاتے ہیں۔ شام چار بجے تک ہم نے یہاں سیاحت میں وقت گزارا۔ اس سے پہلے تقریباً پینتیس سال پہلے یہاں آیا کرتے تھے وہ اُس وقت کہ جب ہم راولپنڈی میں رہتے تھے۔ مری بہت بدل چکا تھا۔ دُکانیں اور ہوٹل نئے اور بہتر تھے، اور آسائشیں زیادہ تھیں۔ لیکن لوگ ابھی بھی ویسے ہی مہمان نواز اور خوش اخلاق تھے، اور پہاڑیاں ابھی بھی ویسی ہی تھیں۔ کچھ نئے درخت اگائے گئے تھے کیونکہ پرانے درخت تو سب لکڑی کاٹنے کے چکر میں کٹ چکے تھے۔ نئے درخت چھوٹے تھے اور ابھی ان کی لکڑی کی قیمت اتنی نہیں تھی۔ یہ صرف سبزہ زار مہیا کر رہے تھے۔

واپسی پر پھر اُسی دھند سے گزرنا پڑا اور ہم حسبِ معمول دعائیں مانگتے ہوئے بیٹھے رہے جب کہ ہماری بیٹیاں اور پوتیاں مل کر گانے گاتی رہیں۔ ہم یہی ڈرتے رہے کہ نجم کی کہیں ان گانوں سے توجہ نہ بٹ جائے، لیکن وہ شاید بچوں کے ساتھ کار چلانے کے عادی تھے اور ہم ساتھ خیریت کے اسلام آباد پہنچ گئے۔

اسلام آباد: مری کے پورے راستے میں کہر اور بادل رہے۔ سڑک نواز شریف نے عالیشان کروادی تھی۔

اس کے بعد ایک دن ایوبیہ گئے۔ لفٹ چیئر وغیرہ سب بند تھیں کہ موسم صحیح نہیں تھا۔ پہلے ہفتے کے بعد یہ جگہ چھوٹی لگنے لگی۔ اسلام آباد میں ہم دو ہفتہ رہے اور واپس تیز گام سے کراچی پہنچے۔

امریکہ کا رُخ

امریکہ میں ۱۹۸۸ء میں اعجاز امریکی امتحان پاس کر کے لاس انجلس میں یونیورسٹی آف سدرن کیلیفورنیا کے ہسپتالوں میں ریزیڈینسی کر رہے تھے اور اب وہیں مقیم تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے ہمارے اوپر امریکہ آنے کا زور ڈالا۔ ہم نے بھی ۱۹۸۲ء کے بعد کوئی بڑا سفر نہیں کیا تھا۔ لہذا جانے کی تیاری کی گئی، اور نیا پاسپورٹ بنوایا گیا۔ پاکستانی پاسپورٹ نے ترقی کر لی تھی۔ اب تصویر اور انگلی کے نشان کے اوپر ایک پلاسٹک چپکا ہوا تھا، لیکن تمام لِکھت ابھی بھی گھسیٹے ہوئے دستی خط میں ہوتی تھی۔ ہم نے امریکہ کا ویزا ۲۶/ دسمبر ۱۹۸۸ء کو لیا۔ یہ تاریخ ہمیں اس لئے یاد ہے کہ اس سے چند دن قبل بے نظیر بھٹو نے وزیرِ اعظم کا حیثیت سے حلف اٹھایا تھا۔ ہم سب خوش تھے کہ یہ پہلی خاتون وزیر اعظم تھیں۔ جنرل ضیاء الحق اگست ۱۹۸۸ء میں پاکستانی فوجی C130 طیارہ کے بہاولپور کے پاس گرنے سے ہلاک ہو چکے تھے۔ امریکی ویزا کے لئے کافی کاغذات اور مالی حالت دکھانا پڑی تب ۳/ مہینے کا ویزا ملا جو کہ ہمیں اس سے پہلے ملے ہوئے تمام ویزوں سے کہیں بہتر تھا۔ ہندوستان، سعودی عرب، اور یورپ کے ویزے تو صرف ایک یا بمشکل دو ماہ کے ملتے تھے۔

نیویارک کے لئے پی آئی اے کی پرواز صبح کے ۲:۳۰/ بجے کے قریب نکلتی تھی۔ اس سے کوئی ۲۷/ گھنٹے بعد اسی دن نیویارک دوپہر کے ۵/ بجے کے قریب پہنچ جاتے تھے لہذا یہ پرواز مناسب تھی۔ پی آئی اے میں کھانا ہماری پسند کا ہوتا تھا اور عملہ اردو بولتا تھا لہذا اس سے بہتر ہماری نظر میں کوئی دوسری ایئر لائین بھی نہیں تھی۔ شام سے لوگ ہم سے ملنے آتے رہے اور امام ضامن باندھتے رہے۔ رات ۱۲/ بجے تک فرصت نہیں ملی۔ اسی طرح بغیر نیند لئے ہم کراچی کے بین الاقوامی ہوائی اڈّہ پہنچے۔ ۱۰/ فروری کی صبح ہو چلی تھی، اور جب ہوائی جہاز نے اپنی اڑان شروع کی تو صبح کے ۴/ بج چکے تھے۔ پرواز مغرب کی سمت تھی۔ اسی وجہ سے طیارہ اڑتا رہا اور کئی گھنٹے کے بعد بھی سورج نہ نکل سکا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ طیارہ آگے آگے بھاگ رہا تھا اور سورج اس کے پیچھے پیچھے لگا ہوا تھا۔ ایران سے آگے کہیں ترکی کے قریب سورج نے جہاز کو آلیا۔ جہاز کے اندر اور نیچے زمین پر سورج کی روشنی ہوگئی۔

فرینکفرٹ پر جہاز ۲/ گھنٹے رُکا۔ یہاں ہم نے دیکھا کہ جہاز کا عملہ بدلا گیا، کھانے کے ڈبّے چڑھائے گئے، اور جہاز میں ایندھن بھرا گیا۔ جہاز پھر ایک چھوٹی سی اُڑان کے بعد پیرس کے پرانے اوغلی

ایئرپورٹ پر اُترا۔ یہاں بھی یہ ۲ر گھنٹے کے قریب ٹھہرا اور یہاں سے یہ یورپی سیّاحوں سے بھر گیا۔ یہاں سے نکلے تو سب سے پہلے برطانیہ کے اوپر سے گزرے۔ نیچے ہر طرف بادل ہی بادل تھے، کچھ نظر نہیں آیا۔ کبھی کبھی بادلوں کے بیچ میں سے کچھ سبزہ زار زمین نظر آتی، ورنہ پھر وہی بادل۔ گرین لینڈ تک پہنچتے پہنچتے بادل کم ہو گئے اور گرین لینڈ نظر آنے لگا۔ ہم نے پڑھا ہے کہ زمین کے اس حصے کو گرین لینڈ اس لئے کہا گیا کہ اس کے سواحل پر گہرے ہرے رنگ کی موٹی سی کائی ہوتی تھی۔ اب یہاں طیارہ سے تو ہر طرف ایسی خوفناک برف نظر آئی کہ ہمیں یہ نام کچھ غلط لگا۔ کہیں کہیں برف کے نہایت عظیم الجثہ گلیشیئر نظر آئے جو کم از کم دس میل چوڑے تھے اور ایک عظیم دریا لگتے تھے۔ یا پھر ایسی زمین جو لگے کہ مریخ یا چاند کی ہو، لیکن برف سے ڈھکی ہوئی۔ اس گرین لینڈ کے بارے میں ہم نے یہ بھی سنا تھا کہ یہاں بارہویں امامؑ کی رہائش ہے۔ ویسے ہم نے یہ بات امریکہ کے جنوب مشرق میں کیریبین کے علاقے کے بارے میں بھی سنی ہے، آگے اللہ زیادہ جانتا ہے۔

گرین لینڈ: یہ تصاویر طیارہ سے لی گئی تھیں۔ دائیں طرف گلیشیر، اور بائیں طرف کسی سیارے کے مانند برفیلی زمین

تقریباً سات گھنٹے کی پرواز کے بعد نیویارک کے جان ایف کینیڈی ہوائی اڈّہ پر شام کے ۶ر بجے پہنچے۔ یہاں ہماری عزیزہ سلطنت اور اُن کے بیٹے حسن ہمیں لینے آئے ہوئے تھے۔ حسن بعد میں ہماری دوسری بیٹی سیما کے رشتے سے ہمارے داماد بنے۔ نیویارک میں ہم ایک ہفتہ ٹھہرے اور کچھ بھی نہیں دیکھا، سوائے اس کے کہ برف بہت تھی۔ گھر کے اندر ان لوگوں نے اس قدر گرمی کر رکھی تھی کہ قمیص شلوار بہت تھے۔ باہر نکلو تو سوٹ کیس کے سارے کپڑے پہن لیں تب بھی سردی نہیں جاتی۔ پورا ہفتہ اپنے عزیزوں سے ملنے ملانے میں نکل گیا۔ نیویارک میں ہمارے درجنوں عزیز آ چکے تھے۔ کچھ عزیز تو فلاڈیلفیا، نیوجرسی اور کنیٹی کٹ تک سے ملنے آئے۔ جمعہ ۱۷ر فروری کو ہم سان فرانسسکو روانہ ہوئے۔

ہماری پرواز یہاں کی یونائیٹیڈ ایئرلائنز سے تھی۔ ہمارے ہونے والے داماد اُس وقت پان امیریکن ایئرویز میں تھے۔ بعد میں یہ ایئرلائنز بند ہوگئی۔ انہیں پان امیریکن سے مفت ٹکٹ ملتا تھا لیکن یہ صرف اُس وقت استعمال ہوسکتا تھا کہ اگر جگہ خالی ہو۔ اب ہم نے بھی اپنا بھی ٹکٹ پان امیریکن سے کروالیا۔ پرواز والے دن ہم ہوائی اڈّے پر آئے اور پان امیریکن کے ٹرمینل پر بیٹھے انتظار کرتے رہے کہ کب پرواز کا وقت قریب ہوتو پتہ چلے کہ جہاز میں جگہ ہے کہ نہیں۔ پرواز کے وقت سے پندرہ منٹ پہلے حسن اور ہمارا نام پکارا گیا تو ہم اُٹھ گئے اور بورڈنگ کارڈ لئے۔ جہاز میں اندر پہنچے تو ہم دونوں کی نشستیں کافی دور دور تھیں۔ پانچ منٹ اسے بدلنے میں لگے۔ اتنے میں جہاز نے راہِ رفتار (Runway) کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ ہلکی ہلکی برف باری ہورہی تھی۔ طیّارہ راہِ رفتار سے بالکل پہلے ایک جگہ رُک گیا۔ یہاں پانی کے دوٹرک آئے اور جہاز پر گرم پانی ڈالنے لگے۔ ہمیں بتایا گیا جہاز کے اڑنے سے قبل اس پر سے برف صاف کرنے کے لئے ڈالا جارہا تھا، اور پانی میں کچھ کیمیکلز بھی ہیں، لہذا ہوا کے پنکھے بھی بند ہو گئے۔ اب چلے تو تقریباً سوا چھ گھنٹے میں سان فرانسسکو پہنچے جہاں ہمارے صاحبزادے شمس ہمیں لینے ہوائی اڈّہ پر آئے ہوئے تھے۔ یہ ان دنوں TRW نامی کمپنی میں پراجیکٹ ڈائرکٹر تھے اور جرمنی میں کسی پراجیکٹ پر کام کررہے تھے۔

شمس نے ہمارے آنے سے صرف چار ماہ قبل ایک گھر خریدا تھا۔ بالکل نیا گھر تھا اور اس کے پچھلے حصّہ میں شمس ابھی کچھ درخت اور گھاس وغیرہ لگوا رہے تھے۔ پورا محلّہ ہی نیا تھا اور تمام گھروں میں کچھ نہ کچھ کام ہورہا تھا۔ گھر کے چاروں طرف پہاڑیاں تھیں جو بارشوں میں بالکل ہری ہوگئی تھیں۔ لگتا تھا کہ یہ گھر ایک سبز کٹورے میں رکھا ہوا ہو۔ ہمارے باقی بیٹے اور بیٹیاں جو امریکہ آکر بسے، سب سے پہلے یہاں ہی اترے۔ اسی وجہ سے ہم لوگوں نے اسے ایلس آئیلینڈ کا نام دے دیا۔ ایلس آئیلینڈ نیویارک میں وہ جگہ ہے جہاں یورپ سے آنے والے تمام مہاجروں کی جانچ پڑتال ہوتی تھی۔ اسی طرح سان فرانسسکو میں اینجل آئیلینڈ ہے جہاں ایشیا سے آنے والے تمام مہاجروں کی جانچ پڑتال ہوتی تھی، لیکن یہ ایلیس آئیلنڈ کی طرح مشہور نہ ہوسکا۔ کیونکہ اینجل آئیلینڈ سے امریکہ آنے والے تقریباً تمام ایشیائی باشندے چینی نژاد تھے، اس لئے اب یہاں چینیوں کو ایشیائی یا ایشین کہا جاتا ہے، اور ہم جیسے پاکستانی اور ہندوستانیوں کا اپنے لئے ایشیائی کا لفظ استعمال کرنا غلط تصور کیا جاتا ہے۔

السوبرانتے: ''جائیں تو جائیں کہاں؟'' ہم السوبرانتے، کیلیفورنیا کے اسی گھر میں گزشتہ ۱۲ سال سے مقیم ہیں۔

السوبرانتے: یہ تصویر شمس کی دوست انکا شوبرٹ نے طیارے سے لیں۔ شمس یہ طیارہ اپنے گھر کے اوپر سے خود پرواز کر کے لے جا رہے تھے۔ دائیں طرف پہاڑیوں میں ہمارا گھر ہے اور بائیں تصویر میں سان پابلو ڈیم نظر آ رہا ہے۔

اس گھر سے ہم کہیں بھی جائیں، راستے میں سان پابلو ڈیم روڈ سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس ڈیم کے ساتھ پہاڑی جنگل چل رہا ہے۔ یہاں ہرن اور چھوٹے شیر وغیرہ بہت ہیں اور جگہ جگہ 'ڈیئر کراسنگ' کے نشان لگے ہوئے ہیں۔ ویسے بھی پہاڑی جگہ ہے اور سڑک بل کھاتی ہوئی ہے۔ بارشوں کے موسم میں اور اندھیرا ہو جاتا ہے اور گاڑیوں کی رفتار کم رکھنا پڑتی ہے۔

غرض اب ہم اِدھر سان فرانسسکو پہنچے تو یہاں ٹھنڈ نیویارک سے کم تھی لیکن بارش ہو رہی تھی۔ ہم نے پھر بھی دوسرے دن شہر دیکھنے کا منصوبہ بنایا۔ شہر دیکھنے نکلے تب بھی بارش ہو رہی تھی، لیکن خلیجِ سان فرانسسکو، یا ''سان فرانسسکو بے'' تک پہنچے تو بارش رگ گئی تھی اور سورج نکل آیا۔ پھر موسم گرم ہو گیا اور لگتا نہیں تھا کہ یہاں سردیاں ہوں۔ ہمارا پہلا پل ''بے برج'' تھا جسے پار کرنے کے لئے ہمیں ایک ڈالر ٹول ٹیکس

دینا پڑا۔ یہ پل دومنزلہ ہے۔ اوپر کی منزل سے کاریں مغرب کی طرف سان فرانسسکو جارہی تھیں، اور نچلی منزل پر کاریں واپس برکلے کی طرف آرہی تھیں۔ پل پار کر کے ہم یہاں کی ففتھ اسٹریٹ سے ہوتے ہوئے سان فرانسسکو کے یونین اسکوائر گئے جہاں ایک زمین دوز پارکنگ کی جگہ کار کھڑی کر کے باہر آئے۔ یہ زمین دوز پارکنگ زمین کے نیچے چار منزلوں پر ہے اور ۱۹۴۱ء میں بنائی گئی تھی۔ یونین اسکوائر میں ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جس کے درمیان ایک مینار کے اوپر ایک مجسمہ تھا جو امریکہ کی اسپین کے مقابلہ میں منیلا (فلپائن) میں فتح کی یادگار کی حیثیت سے ۱۸۹۸ء میں لگایا گیا تھا۔ یہ مجسّمہ جارج ڈیوی کا ہے۔ یہاں لندن کے ٹریفلگر اسکوائر کی طرح کبوتروں کے جھنڈ تھے۔ یونین اسکوائر کے چاروں طرف ہوٹل، دُکانیں اور دفاتر ہیں۔

سان فرانسسکو کیبل کار: دائیں طرف پاول اسٹریٹ ٹرمینل اور ٹرنسٹائل، بائیں طرف فشرمین وہارف کا ٹرمینل۔ اس تصویر میں پرویز نظر آرہے ہیں۔

سان فرانسسکو کی ایک اہم چیز ہے کیبل کار۔ یہ بہت پرانے انداز کی ٹراموں کی طرح بسیں ہیں جن میں اپنا کوئی انجن نہیں ہے۔ ان کو دیکھ کر ہمیں کراچی کی ڈیزل ٹرام کاریں یاد آگئیں جو ۱۹۷۰ء میں بند ہو چکی تھیں۔ سان فرانسسکو کی کیبل کاروں کو زمین دوز موٹے تاروں سے کھینچ کر چلایا جاتا ہے۔ اس کے لئے سیّاح گھنٹوں قطاریں لگا کر کھڑے رہتے ہیں۔ ہم اس میں پاول اسٹریٹ سے لے کر گرارڈ ڈیلی اسکوائر گئے۔

گرارڈ ڈیلی اسکوائر سے گولڈن گیٹ برج سامنے ہی نظر آتا ہے۔ لیکن اس کی اپنی خوبی اور وجۂ مشہوری اس کی چاکلیٹ کی فیکٹری اور تصویروں کی دُکانیں ہیں۔ یہاں ہم نے پاکستانی اور ہندوستانی پتنگوں کی ایک دُکان بھی دیکھی جس کے مالک ایک رامپوری صاحب تھے۔ ان کی دُکانوں میں امریکی طرز کی پتنگیں ۵۰ر سے ۷۵ر ڈالر تک کی تھیں۔ ہمیں حیرانی ہوئی کہ یہاں کے لوگ اتنا پیسا خرچ کرتے ہونگے ان پتنگوں

پر۔ یہاں سے تھوڑا ہی قریب پیدل چل کر ہم فشرمین وہارف گئے جہاں فٹ پاتھ پر مچھلیوں اور کیکڑوں کے ٹھیلے نما ریستوراں تھے اور کچّی اور پکی ہوئی مچھلیوں کی دور تک بساند آرہی تھی۔ لیکن لوگ جوق در جوق ان مچھلیوں کو کھانے کے لئے آتے تھے۔ دوسری طرف کے فٹ پاتھ پر تصویریں بنانے والے فنکار تھے۔ کوئی آپ کی تصویر کیمرہ سے بنا کر فوراً دیتا تھا، تو کوئی آپ کی تصویر صدر جارج بُش اور ان کی بیگم بار برا بُش کے ساتھ کھینچ کر دے دیتا تھا، کہ یہ بُش صاحب اس وقت امریکہ کے صدر تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو لوگوں کی شکل کا کارٹون ۳؍ سے ۵؍ ڈالر میں بنا دیتے تھے۔ ایک شخص اپنے چہرے پر سفید رنگ کئے ہوئے ساکت کھڑا تھا۔ ایسے کردار یہاں مائم (mime) کہلاتے ہیں۔ ایک جگہ یہاں کی ایک پینی کے سکّہ کو کچل کر اس پر سان فرانسسکو لکھنے کے پچاس سینٹ لئے جا رہے تھے۔ غرض ہر وہ چیز نظر آتی تھی جس سے کہ سیاحوں سے پیسے خرچ کروائے جا سکتے ہوں۔ سیاح بھی اس جال میں پھنسنے پر خوش نظر آرہے تھے۔

فشرمین وہارف کے قریب ہی قدیمی کشتیوں اور سمندری جہازوں کی تاریخ کا ایک میوزیم ہے، لیکن وہاں اکّا دکّا لوگ نظر آتے تھے۔ سامنے ہی ایک جزیرے پر یہاں کا قدیم قید خانہ ہے جسے الکٹراز کہتے ہیں۔ یہ اب سیاحت کی جگہ ہے۔ ساتھ ہی اینجل آئلینڈ نظر آرہا تھا۔ دن کے ۱۲؍ بج رہے تھے لہذا اس قیدخانے کو پھر کبھی کے لئے چھوڑا۔ ''اوٹس اسپنک مائز'' نامی ایک ریستوراں میں بیٹھ کر جلدی جلدی ایک ''کوکی'' یا کُکی کھائی اور کافی پی۔ سوا ڈالر کی ایک کُکی ملتی تھی۔ روپوں میں قیمت سوچی تو کُکی کے ایک ہی ٹکڑے سے سیر ہو گئے اور باقی کُکی صرف پیسے وصول کرنے کے لیئے کھائی۔ کھا پی کر کیبل کار سے واپس پاول اسٹریٹ پر آئے کہ کار بھی یہیں کھڑی تھی اور چائنا ٹاؤن بھی اِدھر ہی تھا۔

چائنا ٹاؤن میں سڑکوں کے دونوں طرف چینی لوگوں کی دُکانیں ہیں۔ بازار میں تقریباً تمام سامان چین اور تایئوان کا تھا۔ رنگ برنگے کڑھے ہوئے کپڑے، رنگ سے لدی ہوئی تصویریں، اور سونے، چاندی اور قیمتی پتھروں کے زیورات کی دُکانیں تھیں۔ ایک جگہ مینڈک، سانپ اور طرح طرح کی مچھلیوں کی دُکانیں تھیں۔ سنا تھا کہ سانپ کے علاوہ سب کچھ آپ کے سامنے پکا کر کھانے میں دیتے تھے۔ کیلیفورنیا میں چین سے بہت افراد ریل کی پٹری ڈالنے کے لئے انیسویں صدی میں لائے گئے تھے۔ اس زمانے میں انہیں اپنی عورتیں لانے کی اِجازت نہیں تھی۔ یہاں کے یورپی مہاجروں کی اکثریت نے ان کاموں کے لئے چینیوں سے، اور

فصلوں پر کام کرنے کے لئے افریقیوں سے کام لیا تھا۔ جہاں افریقی ایک فرد کی ملکیت ہوتے تھے، یہ چینی ریل کی کمپنیوں کی ''ملکیت'' میں تھے۔ اسی وجہ سے انہیں غلام نہیں بلکہ مزدوروں کا نام دیا گیا، اگر چہ ان کے اوپر سختیاں اور پابندیاں وہی تھیں جو افریقی غلاموں پر تھیں۔ اب یہ لوگ یہاں ڈیڑھ سو سال سے ہیں اور یہاں ان کی علمی، سیاسی اور معاشی طاقت بہت بڑھ چکی ہے۔ چائنا ٹاؤن سے ہم نے صرف ایک کیبل کار کا نمونہ خریدا اور تصویریں کھنچوائیں۔ اس کے بعد پارکنگ گیراج کی طرف واپس آ گئے۔ اس وقت ۳:۱۵ بج رہے تھے اور اب پھر بارش کا سماں ہو چلا تھا۔ ہم نے کار میں بیٹھ کر گولڈن گیٹ برج کی طرف رخ کیا۔

سان فرانسسکو: چائنا ٹاؤن کے داخلے پر یہ گیٹ صرف سیاحوں کے لئے بنا ہے ورنہ اس کی کوئی اور اہمیت نہیں ہے۔ بائیں جانب ہمارے پوتے محسن ہیں۔

گولڈن گیٹ برج پر اس موسم میں بھی سیاحوں کا جمگھٹا تھا۔ لگتا تھا کہ اس شہر میں چاہے کیسا ہی موسم ہو، سیّاح جوق در جوق پہنچتے ہیں۔ سب سے پہلے جو چیز ہم نے دیکھی وہ یہ کہ اس پُل کا رنگ سنہرا نہیں بلکہ تانبہ کی طرح سرخی مائل تھا۔ اس کا نام گولڈن گیٹ اس وجہ سے تھا کہ انیسویں صدی میں یہاں امریکہ کے مشرق کے باشندے سونا نکالنے آئے تھے اور کیلیفورنیا ریاست کا نام ہی گولڈن اسٹیٹ، یعنی سونے کی ریاست پڑ گیا تھا۔ اس پل کے دونوں کناروں پر پہاڑیاں ہیں اور بیچ میں سمندر ہے۔ اس وجہ سے یہ پُل ایک طرح سے ایک دروازہ سا لگتا ہے۔ پُل کی لمبائی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ہم اسے پیدل چل کر پار کر سکتے تھے، لیکن ہلکی

ہلکی بارش ہونے لگی تھی اور شام کافی ہو چلی تھی۔ ہم نے گھر کی طرف رخ کیا۔

سان فرانسسکو: گولڈن گیٹ بِرج

دوسرے چند دنوں میں ہم نے شہر کے کئی چکر لگائے۔ اس علاقہ میں دو مشہور یونیورسٹیاں ہیں، ایک دوسرے کے ٹکر کی۔ ایک تو برکلے یونیورسٹی ہے شمس کے پرانے دفتر کے قریب۔ یہاں ہم نے ذوالفقار علی بھٹو کا ہاسٹل دیکھا، وہ یہاں کے تعلیم یافتہ تھے۔ دوسری پالوآلٹو میں اسٹینفورڈ یونیورسٹی ہے جس کی عمارت ہمیں زیادہ پسند آئی۔ انداز ایسا لگتا تھا جیسے مشرقِ وسطیٰ کی یا اِسپینی عمارت ہو۔ محرابیں اور گنبد تھے، اور بہت کشادہ جگہ تھی۔ یہاں کے طلبا بھی برکلے یونیورسٹی کے طلبا سے نسبتاً قیمتی لباس میں نظر آ رہے تھے۔

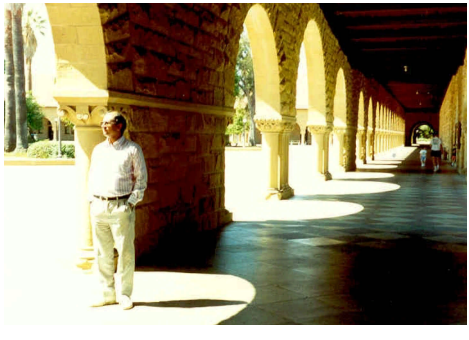

اسٹینفورڈ یونیورسٹی، پالوآلٹو: دائیں تصویر میں شمس اور حسن مین بلڈنگ کے سامنے۔ بائیں تصویر میں نجم اس کے اندر

ہمارے اگلے کچھ دن ایسے ہی گزرے۔ ایک دن شمس کو سوجھی کہ ہمیں طیارہ اڑانے کی ''تربیت'' دی جائے۔ ہم بھی تیار ہو گئے، اور گئے اوکلینڈ ایئرپورٹ کے ذاتی اور کلب کے طیاروں کے حصے کی طرف۔

اُن دنوں شمس اوکلینڈ ایئر پورٹ پر واقع ایلامیدا ایرو کلب کے ساتھ ملحق تھے اور یہاں وہ پرائیوٹ ہوائی جہاز شوقیہ طور پر اڑاتے تھے۔ ایئر پورٹ کا سیکیو ریٹی سسٹم ایسا ہی تھا، لیکن پھر بھی ہر کلب ممبر کو ایک تفصیلی جانچ کے بعد داخلے کا مقناطیسی کارڈ ملتا تھا۔ شمس نے اپنا یہی شناختی کارڈ ایک دروازے کے کارڈ ریڈر میں سے گزارا اور ہم دونوں اس طرح ایئر پورٹ میں داخل ہو گئے۔ اُس وقت یہ بات بالکل عام لگی۔ غرض شمس کے ساتھ ہم ان کے سیسنا ۱۷۲ طیارے میں بیٹھے تو دیکھا کہ اس چھوٹے سے طیارے میں بھی درجنوں گھڑیوں جیسے انسٹرومنٹس لگے تھے۔ شمس نے ہمیں اُن کے بارے میں بتایا اور انجن اسٹارٹ کرنے کا طریقہ بھی بتایا۔ شمس کے ساتھ ہم نے پائلٹ کی طرح انجن اسٹارٹ کیا تو ایک تو شور ہوا اور پھر پورا جہاز جھولنے لگا۔ ہم نے اس کے آگے جانا مناسب نہیں سمجھا اور انجن بند کر کے جہاز سے اُتر آئے۔

اوکلینڈ ایئر پورٹ: ایلامیدا ائرو کلب کا سیسنا ۱۷۲ ار..... اور اس میں ہماری پائلٹ ٹریننگ

بعد ازاں ہم نے گولڈن گیٹ پارک اور کوائٹ ٹاور دیکھا۔ پھر سمندر کے کنارے ''کلف ہاؤس'' نامی ریستوراں گئے جو ایک بہت بڑی چٹان پر ہے۔ ساتھ ہی ''سوتر و باتھ'' نامی ایک قدیم حمام کے کھنڈرات ہیں جہاں کبھی سوئمنگ پول ہوتے تھے اور ایک آڈیٹوریم بھی تھا۔ کلف ہاؤس کے ساتھ ہی ''سیل راک'' نامی ایک چٹان ہے جس پر ''سی لائنز'' دیکھنے کو ملے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ انہیں اردو میں کیا کہتے ہیں، ہم یہاں سے ہائی وے ۱ پر ساحل کے ساتھ چلتے ہوئے فورٹ فنسٹن پہنچے جو ابھی بھی دھند میں گھرا تھا۔

فورٹ فنسٹن پر امریکہ کی بحریہ نے دوسری جنگِ عظیم تک سمندری جہازوں سے دفاع کے لئے دور مار توپیں لگائی ہوئی تھیں۔ کچھ توپیں نمونے کے طور پر ابھی بھی تھیں۔ دوربینیں بھی لگی تھیں۔ یہاں کی سب

سے اچھی اور انوکھی چیز تھی ہینگ گلائیڈ نگ ۔ یہ کھیل ہم نے اس دن سے پہلے صرف ٹی وی کی فلموں میں دیکھا تھا، لیکن اب یہاں دیکھا کہ ہوا باز ایک بھاری سی پتنگ لے کر بھاگتے اور پھر ایک چٹان سے نیچے چھلانگ لگا دیتے ۔ یہاں ہوا تیز چلتی تھی جس سے پتنگ ہوا میں پرواز کرنے لگتی تھی اور پھر ہوا باز اپنی ٹانگیں ایک تھیلے میں ڈال کر ساحل کے ساتھ ساتھ اڑتے رہتے ۔ ہمارے کہنے پر شمس نے ایک ہوا باز سے پوچھا تو ہوا باز نے بتایا کہ یہ لوگ ایک چھوٹا سا پیرا شوٹ باندھ کر چھلانگ لگاتے ہیں کہ اگر کوئی مشکل ہو تو زندہ بچ سکیں ۔

سان فرانسسکو: فورٹ فنسٹن پر ہینگ گلائیڈرز اور گہری دُھند جو یہاں عام ہے۔

یہاں سے واپس ہوتے ہوتے موسم برکلے کی طرف بھی اب دُھند والا ہونے لگا تھا۔ یہ کہنا بھی مشکل ہوتا تھا کہ یہ بادل ہیں یا دُھند۔ بے برج پر چڑھنے سے پہلے ہم ''ایمبارکڈیرو'' پر رُکے جو سان فرانسسکو بے میں داخل ہوتے ہوئے ایک طرح کا پورٹ ہے اور ہوسکتا ہے کہ کسی زمانے میں کیماڑی جیسا ہوتا ہو، لیکن اب یہاں بہت ساری عمارتیں ہیں، اونچی اونچی اور شیشے اور المونیم کی بنی ہوئی۔ زلزلہ آئے تو عمارت گرے نہ گرے، پوری سڑکوں پر شیشے کے ٹکڑے ضرور ہوں۔ یہاں سے دوسرے کنارے پر برکلے اور اوکلینڈ شہر نظر آتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ اوکلینڈ کی طرف بڑے بڑے جہاز کھڑے تھے، کچھ کاریں لا رہے تھے، تو

کچھ جہازوں پر ایک کے اوپر ایک کنٹینرز لدے ہوئے تھے کہ جیسے دس منزلہ عمارت ہو۔ بیچ میں بے برج کا بہت خوبصورت منظر نظر آتا ہے اور یہاں سے بے برج اوپر سے گزرتا ہوا جاتا ہے جس سے اِس کی عظمت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ یہی دیکھتے دیکھتے بادل گہرے ہونے لگے اور ہلکی پھوار شروع ہوگئی تو ہم فوراً کار میں بیٹھے اور گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

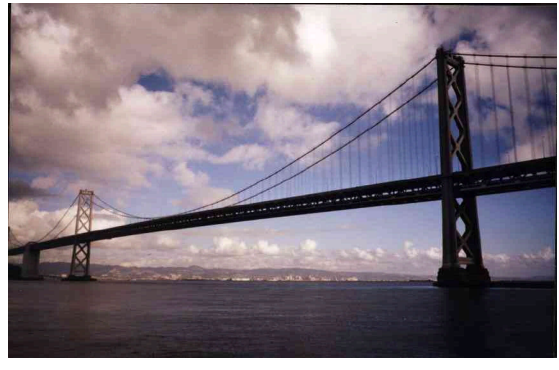

سان فرانسسکو: ایمبارکڈیرو سے بے برج، سامنے اوکلینڈ کا پورٹ

شمس سان ہوزے، سان فرانسسکو، اوکلینڈ میں رہنے کے بعد السوبرانتے میں آباد ہوئے تھے۔ یہاں موسم معتدل ہے۔ سردیوں میں بارشیں ہوتی ہیں جو اکتوبر سے لے کر اپریل تک چلتی ہیں۔ پھر باقی سال موسم خشک رہتا ہے اور گرمیوں میں درجۂ حرارت ۸۵/ یا ۹۰/ فارن ہائٹ سے اوپر نہیں جاتا۔ ان دنوں یہاں ہمارے جاننے والے کم تھے۔ ویسے بھی پاکستانی خاندان ابھی اس جگہ پر اتنے نہیں تھے۔ پاکستانی اور ہندوستانی آبادی زیادہ تر سان ہوزے کی طرف تھی۔ ہم نے ٹیلیفون ڈائرکٹری دیکھ کر کافی پاکستانیوں کے گھر تلاش کر لئے اور اپنی بڑی بہو کے رشتہ داروں کو بھی تلاش کر لیا جن سے ہمیں علم ہوا کہ یہاں ایک بڑی مسجد اور ایک امام بارگاہ کسی کے گھر میں بنے تھے۔ مجلس ہوتی تو لوگ کھانا اور تبرّک اپنے گھروں سے لے جاتے تھے۔ ابھی آبادی اس پورے علاقے ہی میں کم تھی، اور اس پورے علاقے میں صرف دو ایریا کوڈ تھے، ۴۱۵ اور ۴۰۸۔ ہمیں کچھ لوگ ڈیلی سٹی، والنٹ کریک، پال آلٹو اور سان پابلو نام کے قصبوں میں ملے تھے۔ یہ قصبے یہاں شہر کہلاتے ہیں لیکن ان کی حیثیت کراچی کے ڈیفنس یا ملیر سے زیادہ نہیں ہے۔ یہی جاننے بوجھنے میں ایک ہفتہ گزرا تھا کہ شمس کو پھر جرمنی جانا پڑ گیا۔